# حقیقتِ ایمان۔ متفرق مباحث

مرتب : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

## ایمان کے ثمراتِ ظاہری

ایمان سے مُراد یہاں حقیقی ایمان ہے۔ ایمان کے ثمراتِ ظاہری کو درخت کی مثال سامنے رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں پہلے دو پتیاں ہی پھوٹتی ہیں' پھر تنا بنتا ہے' اس تنے میں سے شاخیں نکلتی ہیں اور پھر پتے' پھول اور پھل نکلتے ہیں۔ جس قدر درخت اوپر کو اٹھے گا اسی اعتبار سے اس کی جڑ مضبوط ہوتی جائے گی۔ اسی طرح جتنا ایمان مضبوط ہو گا اسی اعتبار سے عمل صالح' تواصی بالحق' تواصی بالصبر' جہاد فی سبیل اللہ' ارکانِ اسلام' اطاعت' عبادت اور وفاو فدا کاری میں نکھار آتا چلا جائے گا۔ گویا کہ یہ سارے اعمال ایمان کے ظاہری برگ و بار ہیں۔ حدیث جبریل میں جو لفظ "احسان" استعمال ہوا ہے اس سے مُراد ایمان کے ثمراتِ ظاہری کا نقطہ عروج ہے۔ ان اعمال میں جس قدر شدت' اخلاص اور عمدگی ہوگی اسی اعتبار سے درجۂ احسان میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ کیونکہ احسان کے معنی کسی کام کو عمدگی اور خوبصورتی سے ادا کرنے کے ہوتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے :

((وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوْا الذِّبْحَ))[1]

"جب جانور کو ذبح کرنا ہو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو"۔

یعنی ہر کام بحسن و خوبی کرو' نماز پڑھو تو اچھی پڑھو۔ دین کے جو بھی کام ہیں ان میں خوبصورتی' حسن اور رعنائی ہونی چاہئے۔ حسن و خوبی کے ساتھ ساتھ ہر کام میں شدت اور گہرائی ہو تا کہ جہاد و مجاہدہ میں بھی اتنی ہی شدت ہو۔ ایثار و قربانی میں بھی شدت ہو۔ نماز میں بھی وہ کیفیت ہو کہ معراج المومن بن جائے۔ اسی کو شریعت میں احسان کا نام دیا گیا ہے اور حدیث جبریل (جس کا تذکرہ گزر چکا ہے) میں بھی احسان سے یہی کیفیت مُراد ہے۔

## ایمان اور فطرت

ایمان کا اصل حاصل اور لب لباب امن ہے' اور امن سے مراد ذہنی و قلبی سکون و اطمینان ہے۔ یہ دو اعلیٰ ترین استعدادات (faculties) ہیں جو ہر انسان میں موجود ہیں جنہیں ہم دل و دماغ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو بھی الجھن ہوتی ہے' قلب کو صدمہ ہو' ذہن کو فکر ہو' اندیشے ہوں' سب کا تعلق انہی دو چیزوں سے ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جن کے یہ دونوں اعضاء (faculties) متحد ہوں اور ان کی شخصیت منقسم (split) نہ ہو کہ دل کچھ کہہ رہا ہو اور دماغ کچھ اور کہہ رہا ہو' بلکہ دل و دماغ کے اتحاد کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرۃ انہوں نے جو بھی راستہ اختیار کیا ہو وہ اسی پر گامزن ہوں۔

ایمان کے ذریعے ان تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے جن سے فلسفہ بحث کرتا ہے ـــــ مثلاً :

(۱) اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) کیا یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی؟

(۳) کیا یہ خود بخود بن گئی ہے اور خود بخود چل رہی ہے؟ یا اسے کوئی بنانے اور چلانے والا ہے؟

(۴) اس سے ہمارا کوئی ربط و تعلق ہے یا ربط الحادث بالقدیم کا سا معاملہ ہے؟

(۵) اگر یہ کائنات حادث ہے اور اس کا خالق قدیم' تو ان کے مابین ربط و تعلق کیا ہے؟

(۶) ہماری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اور مبدأ و معاد کیا ہے؟[۲]

(۷) خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ یہ کوئی مستقل اقدار (values) ہیں یا ہمارا خیال ہی ہے؟

(*Nothing is good or bad; only thinking makes it so.*)

(۸) علم کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ علم بالحواس اور علم بالعقل کو تو ہم جانتے ہیں' لیکن کیا اس سے وراء بھی کوئی ذریعۂ علم (source of knowledge) ہے؟

(۹) انسان کے محرکاتِ عمل کیا ہیں؟ آیا صرف حیوانی جبلتیں ہی ہیں یا اس سے بالاتر بھی انسانی وجود کی کوئی حقیقت ہے؟

یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن سے فلسفے کی مختلف شاخیں مثلاً مابعد الطبیعیات (Metaphysics)' اخلاقیات (Ethics) اور نفسیات (Psychology) بحث کرتی ہیں۔

جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا ہے تب اہل دانش ان سوالات پر غور کرتے رہے ہیں۔ ہر دانشور نے اس کا world-view پیش کیا ہے۔ ایمان بھی درحقیقت ایک مکمل تصورِ کائنات (world-view) یا فلسفے کی جرمن اصطلاح میں (Weltanshauung) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایمان ہی وہ تصویر کائنات ہے جو فطرت انسانی کے ساتھ کامل مطابقت رکھتا ہے۔ ایمان ہی کے ذریعے سکون' انبساط اور معرفت ملتی ہے' جس سے سارے مسائل کا حل سامنے آجاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی جان لیں کہ نور سے انسان کو سکون ملتا ہے اور اندھیرے سے بے چینی ملتی ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہو جائے تو آدمی بے چین ہو جاتا ہے' کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ آگے کون ہے اور پیچھے کون؟ اس کے برعکس روشنی میں سب معلوم ہو جاتا ہے کہ آگے کیا ہے؟ پیچھے کیا ہے؟ دائیں اور بائیں کیا ہے؟

حقیقی مؤمن ہونے کی صورت میں ذہنی و قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ قلب کو دو قسم کے احساسات درپیش ہوتے ہیں' ایک کیفیت خوشی' اطمینان' انبساط اور مسرت کی ہوتی ہے جبکہ دوسری کیفیت غم' رنج' صدمہ' کرب اور دکھ کی ہوتی ہے۔ آج کی نوجوان نسل میں "وجود کا کرب" نامی فلسفہ بہت مشہور ہو رہا ہے۔

دل میں اگر رنج و الم ہو تو دماغ میں اندیشے اور تشویش پیدا ہوتی ہے' جس کی مختلف شکلیں ممکن ہیں' مثلاً فلاں جانور نقصان نہ پہنچادے' سانپ نہ کاٹ لے' فلاں افسر یا باس ناراض نہ ہو جائے۔ دل کے رنج و غم اور دماغ کے اندیشے اور تشویش کو قرآن نے حزن و خوف کا نام دیا ہے۔ جب امن ہو گا تو "خوف و حزن" نہیں ہو گا۔ اور ایمان کا لازمی نتیجہ "امن" ہے یعنی زوالِ حزن و خوف۔ لہٰذا اگر کوئی انسان خوف و حزن سے نجات پالے اور اسے سکون و اطمینان مل جائے تو یہ اس کے قلبی ایمان کی نشانی ہے۔

## ایمان اور تصوف

"تصوف" ایک مجہول النسب لفظ ہے۔ بہرحال مسلمانوں میں یہ اصطلاح مشہور

ہو چکی ہے اور ایک بڑے طبقے کے ہاں مقبول و معروف ہے۔ تصوف کا لفظ نہ تو قرآن حکیم میں ہے اور نہ ہی غالباً حدیث رسول اللہ ﷺ میں موجود ہے۔

لفظ تصوف کا وزن "تَفَعُّلْ" ہے، لیکن اس کا ثلاثی اصل کیا ہے؟ معلوم نہیں۔

کچھ لوگوں نے "تصوف" کا اصل "صوف" مانا ہے، یعنی اونی لباس، کیونکہ ابتداءً صوفیاء اپنے جسم کو تکلیف دینے اور نزاکت سے بچانے کے لئے اونی کپڑے استعمال کرتے تھے، غالباً یہی بات صحیح ہے۔ کچھ دوسرے حضرات نے "تصوف" کا اصل "صفا" قرار دیا ہے، لیکن ہماری معلومات کی حد تک "صفا" سے لفظ تصوف کسی شکل میں نہیں بنتا۔ قرآنی اصطلاح کے مطابق تصوف کا موضوع ولایت یا موالاتِ باہمی ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مولیٰ اور ولی ہے، فرمایا :

﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾

(البقرة : ۲۵۷)

"جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے، وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے"۔

اسی طرح اہل ایمان بھی اللہ کے ولی ہیں۔ فرمایا :

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾

(یونس : ۶۲)

"سن لو جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے"

## تصوف کا مقصد

تصوف کا مقصد یہ ہے کہ ایمان انسان کے قال سے آگے بڑھ کر حال کی شکل اختیار کرلے۔ کسی کا زبان سے ایمان کا اقرار کرنا اور چیز ہے، لیکن ایمان انسان کے جسم پر ایک کیفیت کے ساتھ نظر آئے یہ دوسری چیز ہے اور یہی تصوف کا مقصد و منشا ہے۔

## تصوف کا فلسفہ

مسلمانوں میں تصوف کے حوالے سے کچھ لوگ معروف ہوئے ہیں جیسے ہندی، فارابی، ابن سینا، ابن رشد وغیرھم، لیکن یہ تمام حضرات ارسطو کے متبعین ہیں انہوں نے ارسطو کی منطق کے حوالے سے دین کو سمجھنے کی کوشش کی، اور بڑی سخت ٹھوکریں کھائی

ہیں۔ فی زمانہ ان کے متبعین میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن [۳] کا نام بھی آتا ہے۔ "اصل میں مسلمانوں کے صحیح فلسفی صوفیاء ہیں" [۳] یہ جملہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا ہے (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور ان کی کوتاہیوں کو معاف فرمادے) اگرچہ وہ صوفیاء کے کٹر دشمن تھے اور ان کے خیال میں تصوف کل کا کل ضلالت ہے۔ اتنے شدید اختلافات کے باوجود مولانا کو تسلیم تھا کہ اسلام کے اصل فلسفی صوفیاء ہی تھے۔ جہاں تک تصوف کا فلسفیانہ پہلو ہے تو وہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے' البتہ تصوف کا عملی پہلو "تزکیۂ نفس" اکثر لوگوں کو معلوم ہے۔

میرے نزدیک تاریخ انسانیت کے سب سے بڑے ماہرین نفسیات صوفیاء کرام تھے۔ جس طرح انہوں نے نفس انسانی کی گہرائیوں میں اتر کر مشاہدہ کیا ہے کہ حقائق کیا ہیں؟ انسان کے اندر کیا کچھ موجزن ہے؟ انسان کے نفس کے اندر کیسے کیسے طوفان برپا ہیں؟ جدید مادہ پرست ماہرین نفسیات کی تو وہاں تک رسائی ہی نہیں۔

## بے خدا فلسفہ

فلسفہ اور محض فلسفہ جس میں سارا دارومدار منطق پر ہوتا ہے اور منطق جو ہمارے حواس اور معلومات پر مبنی ہے اس کی منطقی انتہاء (Logical climax or end) ارتیابیت یا لاادریت ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے دلیلوں کے ذریعے اللہ کو ماننا ہے تو قطعاً اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے پہلے خطبے میں کہا تھا کہ وجودِ باری تعالیٰ کے لئے جتنے بھی دلائل (arguments) دیئے گئے ہیں وہ سب ایک دوسرے کو کاٹ دیتے ہیں۔ دلیل' دلیل کو کاٹ دیتی ہے۔ منطق' منطق سے کٹ جاتی ہے۔ چنانچہ منطق اور دلائل سے آپ اللہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے لئے کچھ اور کام کرنے پڑتے ہیں جن کے ذریعے انسان کو نعمت یقین حاصل ہوتی ہے۔

## تصوف کا میدان

تصوف میں جو چیزیں زیر بحث آتی ہیں وہ سلوک ہے' تقرب الی اللہ کی منزلیں طے کرنا ہے' وصول الی اللہ کے لئے آگے بڑھنا ہے' جس میں کئی مقامات اور منزلیں آتی

ہیں : مقامِ صبر' مقامِ شکر' مقامِ محبت' مقامِ تسلیم و رضا اور مقامِ توکل و تفویض۔
بہرحال تصوف کا حاصل مرتبۂ ولایت ہے جس کو قرآن حکیم نے ﴿ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴾ اور
﴿ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ کہا ہے۔ یعنی بندہ اللہ سے راضی' اللہ بندے سے
راضی' بندہ اللہ کا دوست اور اللہ بندے کا دوست —— اور دوستی بھی ایسی مثالی جس
کا نقشہ حدیث قدسی میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((اِنَّ اللّٰهَ قَالَ : مَنْ عَادٰى لِىْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ ' وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ ' وَمَا يَزَالُ عَبْدِیْ يَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ ' فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ : كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ يَسْمَعُ بِهٖ ' وَبَصَرَهُ الَّذِیْ يُبْصِرُ بِهٖ ' وَيَدَهُ الَّتِیْ يَبْطِشُ بِهَا ' وَرِجْلَهُ الَّتِیْ يَمْشِیْ بِهَا ' وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِيَنَّهٗ ' وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِيْذَنَّهٗ' وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ ' يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَكْرَهُ مَسَاءَتَهٗ)) (۵)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : "جس نے میرے ولی (دوست) کے ساتھ دشمنی کی میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتا ہوں۔ جو کام میں نے اپنے بندے پر فرض کر رکھے ہیں ان سے زیادہ کسی دوسرے ذریعے سے میرا بندہ میرا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ تاہم بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کی ٹانگ بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیتا ہوں۔ اور میں کسی کام میں بھی اتنے تردد سے کام نہیں لیتا جتنا تردد مجھے مؤمن کی جان نکالنے کے بارے میں ہوتا ہے۔ مؤمن کو موت ناپسند ہوتی ہے اور میں بھی اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا"۔

یہ مرتبہ ولایت ہے، جس کے نتیجے میں انسان اسلام اور اس کے بعد ایمان کی منزلیں طے کر کے مرتبۂ احسان پر فائز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مرتبۂ ولایت ایمان میں گہرائی کا نتیجہ ہے۔ ایمان کی گہرائی، گیرائی، شدت اور قوت کی وجہ سے وہ انسان کا حال بن جاتا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو گی تو بندے کی اطاعت، دلی کیفیت، فطرت، اللہ کے لئے فدائیت و فدویت آسمان کو چھونے لگے گی۔ گویا کہ وہ ﴿ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴾ کا عملی نمونہ پیش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایمان کی مثال درخت سے اس لئے دی ہے کہ درخت جس قدر اونچا ہوتا جاتا ہے اسی اعتبار سے اس کی جڑ زمین میں گہری اور مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ یہ مقابلے میں دو طرفہ عمل ہے۔ جس قدر جڑ نیچے گہری ہو گی اسی اعتبار سے برگ وبار اوپر نظر آئیں گے اور جس قدر درخت کا ظاہری پھیلاؤ زیادہ ہو گا اسی اعتبار سے اس کی جڑ زمین میں گہری ہو گی۔ اگر ایمان جڑ کا حکم رکھتا ہے تو برگ وبار اور شاخیں نیک اعمال کا مقام رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے مرتبۂ ولایت اور احسان میں کوئی فرق نہیں، لیکن پوشیدہ جڑ اور ظاہری شاخوں اور پتوں کا اپنا علیحدہ علیحدہ مقام ہے۔

## تقدیر پر ایمان

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا لازمی خاصہ تقدیر پر ایمان ہے۔ انسان تسلیم و رضا کا خوگر بن جائے، یعنی راضی برضائے رب رہے۔ وہ اس بات پر یقین کرلے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، چاہے اس میں مادی اسباب وعلل کتنے ہی کیوں نہ ہوں، لیکن مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ باذنِ ربی ہو رہا ہے، لہٰذا جو کچھ میرے رب کی طرف سے آئے اس پر کیا شکوہ و شکایت؟ کیا رنج؟ کیا غم؟ یقیناً اسی میں میری خیر ہے۔ میں تو کوتاہ نظر ہوں، میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ میری بھلائی کس میں ہے۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ ﴾ (البقرۃ : ۲۱۶)

"ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم

نہیں جانتے۔"

تو معلوم ہوا کہ راضی برضائے رب رہنا درحقیقت تسلیم و رضا کا نام ہے۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی!

اسی کا منطقی نتیجہ یا تصویر کا دوسرا رخ "توکل اور تفویض" ہے۔

## رضا و توکل میں فرق

رضا کا تعلق اُس نتیجے پر ہے جو ہم پر وارد ہو رہا ہے' یعنی جو بھی حالات آ رہے ہیں۔

﴿ مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (التغابن : ۱۱)

"کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن سے ہی آتی ہے"۔

اس کے بالمقابل جو اعمال' بھاگ دوڑ' سعی' جدوجہد اور تگ و دو ہم سے صادر ہو رہے ہیں ان کے نتائج پر اطمینان توکل کہلاتا ہے۔ سارے اسباب و وسائل موجود ہوں لیکن جب تک اللہ نہ چاہے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ مثلاً آپ کو کل کہیں جانا ہے' گاڑی اے ون حالت میں ہے' پٹرول وغیرہ بھی ٹھیک ہے' اگر آپ نے کہہ دیا کہ میں کل ضرور وہاں جاؤں گا تو آپ اللہ کو بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت و اِذن درمیان میں یاد نہیں رہا۔

## معرفتِ رب کے مقامات

امام رازیؒ نے معرفتِ رب کے تین مقام بیان کئے ہیں :

(۱) معرفتِ رب کا بلند مقام تو یہ ہے کہ ہر شے سے پہلے اللہ نظر آئے۔
(۲) درمیانی مقام یہ ہے کہ ہر شے کے ساتھ اللہ نظر آئے۔
(۳) اس کا ادنیٰ مقام یہ ہے کہ واقعے کے بعد اللہ یاد آ جائے۔

ذرا غور کریں کہ ہمیں تو نہ اللہ نظر آتا ہے نہ یاد آتا ہے' بس ظاہری عوامل پر غور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا واقعات و حادثات کے نتیجے میں ایمان بیدار ہوتا ہے نہ توکل پیدا ہوتا ہے۔

## توکل کا صحیح مفہوم

عام طور پر توکل کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جاؤ۔ یہ توکل

نہیں ہے۔ بلکہ پوری طرح محنت کرنا ضروری ہے' جیسا کہ قرآن حکیم دشمن کے خلاف وسائل حرب تیار رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ فرمایا :

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ . . . ﴾

(الانفال : ٦٠)

"اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لئے تیار رکھو۔"

کسی شاعر نے اس شعر میں توکل کا سارا مفہوم و مدعا بیان کر دیا ہے ؎

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
نتیجہ اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

مگر تمام اسباب و ذرائع کے ہوتے ہوئے کبھی یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان وسائل کی وجہ سے نتیجہ برآمد ہو جائے گا' بلکہ وہی ہو گا جو اللہ چاہے گا' "مَاشَآءَ اللّٰهُ كَانَ مَالَمْ يَشَالَمْ يَكُنْ" یعنی جو اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا وہ نہیں ہو سکا۔ مثلاً آپ نے کسی کام کے لئے بڑی محنت و کوشش کی' عرصہ دراز تک تگ و دو کرتے رہے مگر وہ نہ ہو پایا اور کسی وجہ سے موقع ہاتھ سے نکل گیا تو جس آدمی کے دل میں توکل نہ ہو گا اس کا حال یہ ہو گا کہ رنج و غم اور صدمہ لئے بیٹھا ہے کہ اتنی محنت کی' پیسہ خرچ کیا' سفارشیں لڑوائیں' لوگوں کی خوشامد کر کے اپنی عزت کو برباد کیا' سب کچھ کر کے دیکھ لیا مگر کام نہیں بنا۔ لیکن اگر ایمان بالقدر موجود ہو اور بالخصوص توکل دل میں سمایا ہوا ہو تو ایسی صورت میں نہ کوئی پریشانی ہو گی اور نہ خلافِ توقع نتائج پر رنج و اَلم ہو گا۔ ایک حدیث سے اس ضمن میں واضح راہنمائی ملتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ :

كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا ' فَقَالَ لِي : (( يَا غُلَامُ ' اِنِّي اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ ' اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ ' اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ ' اِذَا سَاَلْتَ فَاسْاَلِ اللّٰهَ ' وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ ' وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ ' وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ ' لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ ' رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ )) (٦)

میں ایک روز رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا۔ آپؐ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا : "اے نوجوان! میں تمہیں کچھ باتیں سکھانا چاہتا ہوں' اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہاری حفاظت فرمائے گا' اللہ کو یاد رکھو تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے' جب مانگو تو اللہ سے مانگو' جب مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو' اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ اگر تمام لوگ مل کر تمہیں کوئی نفع دینا چاہیں تو صرف اتنا ہی نفع دے پائیں گے جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور اگر سارے انسان مل کر تمہیں کچھ نقصان پہنچانا چاہیں تو صرف اتنا ہی نقصان دے سکیں گے جتنا اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھائے جا چکے ہیں اور رجسٹر خشک ہو چکے ہیں"

اسی حدیث میں آیا ہے کہ :

((وَاعْلَمْ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَاَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ)) (۷)

"اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ جو چیز تمہیں مل چکی ہے وہ کبھی تم سے خطا نہیں ہو سکتی تھی اور جو تمہیں نہیں ملی ہے وہ کبھی تمہیں مل نہیں سکتی تھی"۔

انسان کو مایوسی اور frustration سے بچانے والی شے تسلیم و رضا کی خو ہے۔ سارے نفسیاتی امراض جنہیں ہم دماغی امراض بھی کہتے ہیں frustration کا نتیجہ ہیں اور ان سب کا ازالہ یقین محکم اور ایمان بالقدر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ :

((اَنَّ كَلِمَه لَو تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ))

"لفظ "لَوْ" (اگر) سے شیطان کا کام شروع ہو جاتا ہے۔"

یعنی یہ کہنا کہ اگر میں یوں کرتا تو یہ ہو جاتا اور اگر اس طرح کرتا تو یہ نتیجہ نکل آتا' اس سے شیطان کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ تمہاری مرضی کے مطابق نتیجہ کیسے نکل آتا؟ جو اللہ کا فیصلہ تھا وہی نتیجہ نکلنا تھا' لہٰذا تمہاری یہ سوچ ایمان کے منافی ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر ذرا غور کریں کہ اگر انسان پر ایمان کے حقائق منکشف ہو جائیں' اس کے دل میں راسخ ہو جائیں' بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کا حال بن جائیں تو اس کے بعد کیسا رنج اور کیسا خوف؟ خوف اسی وقت ہوتا ہے جب غیر مطلوبہ نتائج کا خطرہ ہو' لیکن

جب یقین ہو جائے کہ جو اللہ چاہے گا وہی ہو گا' کسی کے ہاتھ میں نہ میری برائی ہے اور نہ اچھائی ہے تو پھر انسان کیونکر کسی کے سامنے ذلیل ہو گا؟ کیونکر کسی کی خوشامد کرے گا؟

اب تسلیم و رضا اور تفویض و توکل کو ایک جگہ جمع کرلیں تو نتیجہ نکلے گا "ایمان بالقدر" ___ جو ہمارے ایمانیات کا اہم اور لازمی جزو ہے۔ حدیث جبریل میں آیا ہے :

((اَنْ تُؤْمِنَ بالقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ)) "اور یہ کہ تم اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان لاؤ"۔

## ایک مغالطہ اور اس کی وضاحت

**مغالطہ :** تقدیر کے ضمن میں آج کل ایک خاص قسم کا عقلیت پسندانہ (rationalistic) اندازِ فکر اختیار کیا جاتا ہے کہ تقدیر کے موضوع کو بند ہی رکھو' یہ ذرا مشکل موضوع ہے اور یہ ایک معمہ ہے۔ کیونکہ جونہی تقدیر کا لفظ ہمارے سامنے آتا ہے جبریت (predeterminism) کا تصور آجاتا ہے اور اگر جبریت کو صحیح مان لیا جائے تو پھر حساب کیسا؟ جزا و سزا کس چیز کی؟ اگر کوئی نیکی یا بدی مجبوراً کر رہا ہے تو بدلہ کیوں؟

**وضاحت :** دراصل ایمان بالقدر اللہ تعالیٰ کی دو صفات پر پختہ ایمان و یقین کا لازمی نتیجہ ہے :

(۱) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی اس کی قدرت ہر چیز پر غالب ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا علم تمام اشیاء کا احاطہ کئے ہوئے ہے کہ ماضی و مستقبل کا کوئی کام اس کے علم سے باہر نہیں۔

اس ضمن میں درج ذیل آیات پر ایک نگاہ ڈال لیں :

(۱) ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ (۹)

"اللہ تعالیٰ ہر چیز پر کامل قدرت رکھنے والا ہے"

(۲) ﴿ اَلَآ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ﴾ (فصلت : ۵۴)

"آگاہ رہو اس کی ذات ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے"

(۳) ﴿ وَکَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا ﴾ (النساء : ۱۲۶)

"اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے"

(۴) ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴾ (الطلاق : ۱۲)

"اللہ تعالیٰ نے علم کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے"

(۵) ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴾ (آل عمران : ۱۲۰)

"جو کچھ یہ کر رہے ہیں یقیناً اللہ نے اس کا بھی احاطہ کیا ہوا ہے"

احاطۂ قدرت اور احاطۂ علم کو سمجھ لینے سے تقدیر کا عقدہ حل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ پیشگی علم (fore-knowledge)' جبریت (predetermination) کو مستلزم نہیں ہے۔ اگر کسی چیز کا آپ کو علم ہو گیا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اگر وہ شے ہو رہی ہے تو آپ کے جبر کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ ان دونوں کو علیحدہ کر لیں تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔

سادہ ترین مثال ہے کہ آپ کسی بچے کے سامنے خوشنما اور خوبصورت کھلونا رکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ بچہ لامحالہ اس کی طرف متوجہ ہو گا اور آپ کا اندازہ صحیح ثابت ہو گیا۔ لیکن کیا بچے نے آپ کے جبر کے تحت اس کھلونے کی طرف توجہ کی؟ یا صرف آپ کا اندازہ تھا جو عملاً صحیح ثابت ہوا؟ اور ہمارا اندازہ صحیح بھی ثابت ہو سکتا ہے اور غلط بھی' لیکن اللہ کا علم کبھی غلط نہیں ہو سکتا' کیونکہ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کون کس وقت کیا کرے گا یہ اللہ کو پیشگی معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کفر و ایمان دونوں کے اختیار میں آزادی دے رکھی ہے۔ فرمایا :

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (الکہف : ۲۹)

"اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔"

معلوم ہوا کہ انسانوں کو اختیار تو ہے البتہ اللہ تعالیٰ کو بخوبی علم ہے اور اللہ کا علم غلط نہیں ہو سکتا۔ اور ہو گا وہی جو اللہ کے علم میں ہے اگر آپ fore-knowledge کو predetermination سے علیحدہ کر دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن یہ جان لیجئے کہ بہرحال تقدیر پر ایمان' ایمانیاتِ اسلام کا لازمی جزو اس لئے کسی بھی جدید فکر یا رجحان کی وجہ سے آنکھیں بند کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

## توکل و تفویض اور اس کے نفسیاتی ثمرات

ہر مسلم و مؤمن کا ایمان اس کیفیت کا ہونا چاہے کہ محنت ضرور کرے لیکن نتائج کے

بارے میں کہے :

﴿ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ۝ ﴾

(المومن : ۴۴)

"میں اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں' یقیناً وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔"

اور اللہ کا جو فیصلہ ہو گا میں اس پر راضی ہوں۔ ٹھیک ہے میں محنت کر رہا ہوں' اپنے فرائض ادا کر رہا ہوں' بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ جو کچھ آپ کر سکتے ہیں وہ تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا' لیکن اس کے بعد نتائج کے بارے میں توکل اللہ کی ذات پر ہو نہ کہ وسائل و اسباب پر۔ چنانچہ فرمایا :

﴿ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا۝ ﴾ (بنی اسرائیل : ۲)

"کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل (کارساز) نہ بنانا"۔

تفویض میں اس قدر سکون و اطمینان ہے کہ نہ کوئی تشویش نہ کوئی چنتا۔ معاملہ اللہ کے سپرد کیا اور مطمئن ہو گئے۔ کسی فارسی شاعر نے اس مفہوم کو بہت خوبصورتی کے ساتھ ایک شعر میں سمو دیا ہے۔ ؎

کار سازِ ما بہ فکر کارِ ما
فکر ما در کارِ ما آزارِ ما

اس شعر کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اس حدیث پر غور کر لیں تو بات بن جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((مَنْ كَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ)) (۱۰)

"جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کر رہا ہو تو اللہ اُس شخص کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔"

یہ تو انسانوں کا آپس میں معاملہ ہوا۔ اگر آپ اللہ کے کام میں لگ جائیں تو کیا اللہ بے مروت ہے؟ کیا خیال ہے اگر آپ اللہ کے کام میں لگ جائیں تو وہ آپ کے کاموں کو درست نہ کرے گا؟ چنانچہ نصرتِ خداوندی کے حصول کا لازمی ذریعہ کون سا ہے؟ فرمایا :

﴿ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ... ﴾ (محمد : ۷)

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔"

تم اللہ کے دین کی نصرت میں لگ جاؤ' اس کا جھنڈا اُٹھاؤ' وہ لازماً آپ کا بھلا ہی چاہے گا۔ اس کے بعد اگر میں واقعتاً اللہ کا بندہ بن جاؤں' اس کے لئے اپنے آپ کو کھپا دوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے میرے سارے کام سیدھے نہ کر دے گا۔ جب میرا کارساز ہی میری فکر میں ہے تو پھر پریشانی کیسی' اور چنتا کس چیز کی؟ اور اگر میں اپنے کام خود کروں گا تو لازماً کچھ نہ کچھ بگاڑ بیٹھوں گا۔ میرا علم کامل نہیں لہٰذا میں ٹھوکر کھاؤں گا اور نتیجتاً "فکر ما در کارِ ما آزارِ ما" بن جائے گا۔ لہٰذا سارے کام اللہ کے سپرد کر کے پرسکون ہونا ہی خیریت کا موجب ہے۔ اسی لئے فرمایا :

﴿ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ ○ ﴾

(المومن : ۴۴)

## قرآن حکیم کے ذریعے علاج غم و حزن

ہمارا مقام ہے عبدیت اور عبدیت کی شدت و گہرائی ہے مرتبہ ولایت' جس کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے :

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ ﴾

(یونس : ۶۲)

"جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

اولیاء اللہ کوئی خارجی مخلوق نہیں بلکہ انسانوں میں سے ہیں۔ ان کے ایمان کی گہرائی بہت اتھاہ ہوتی ہے' لہٰذا نتیجہ نکلتا ہے :

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ﴾ (یونس : ۶۳'۶۴)

"جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا دنیا و آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لئے بشارتیں ہی بشارتیں ہیں۔"

لہٰذا ان کے لئے دنیا و آخرت میں بشارتیں ہی بشارتیں ہیں' ان کے لئے کسی رنج و غم اور افسوس کا سوال ہی نہیں' بلکہ ﴿ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴾ اور ﴿ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ کے مقام پر فائز ہیں۔

ایک دعا پر غور کریں جس میں مقام عبدیت ' سپردگی ' تفویض ' راضی برضاء رب ہونے کی کیفیت اور قرآن کے ذریعے اپنے رنج و غم کے ازالے کی درخواست یکجا جمع ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جس کسی کو کبھی بھی کوئی تکلیف ہو تو وہ اگر یہ دعا پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے غم کا ازالہ کر کے اس کی جگہ خوشی بھر دیتا ہے۔ دعا یوں ہے :

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ ' وَابْنُ عَبْدِكَ ' وَابْنُ اَمَتِكَ ' نَاصِيَتِیْ بِيَدِكَ ' مَاضٍ فِیَّ حُكْمِكَ ' عَدْلٌ فِیَّ قَضَآؤُكَ ' اَسْاَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ ' سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ ' اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ ' اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِی عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ ' اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجَلَاءَ حُزْنِی ' وَذَهَابَ هَمِّی))[11]

"اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں ' میرا باپ بھی تیرا ادنیٰ غلام تھا ' میری ماں بھی تیری کنیز تھی ' میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ میرے وجود پر تیرا ہی حکم جاری و ساری ہے۔ میرے بارے میں آپ کا جو فیصلہ ہو وہ انصاف ہی انصاف ہے۔ ہر اس اسم مبارک کے واسطے سے جو تیرا ہے ' جس سے تو نے اپنے آپ کو خود موسوم کیا یا اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تو نے وہ نام سکھایا یا خزانہ غیب میں اپنے پاس محفوظ فرمایا ' ان سب ناموں کا واسطہ دے کر میں درخواست کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کو میرے دل کی بہار بنا دے ' میرے سینے کا نور بنا دے اور میری پریشانی کو دور کرنے والا نسخہ بنا دے اور میرے غم و تفکر کے ازالے کا ذریعہ بنا دے"۔

عظمت قرآن پر اس سے بڑی کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ قرآن کا مقام بتمام و کمال اللہ جانتا ہے ' پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں ؎

"قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری!"

# شعوری و غیر شعوری ایمان

## شعوری ایمان :

شعوری ایمان وہ ہے جس کے ساتھ intellectual element موجود ہو' یعنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کا اتحاد ہو۔

ایمان و یقین کا محل و مقام تو قلب ہے اور سوچ بچار کا مرکز دماغ ہوتا ہے۔ جب دل و دماغ کی سوچ ایک ہو تو وہ شعوری ایمان ہوتا ہے۔ اسی کیفیت کو قرآن حکیم نے "علیٰ وجہ البصیرۃ" کا نام دیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زبانی اعلان کروایا گیا :

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ﴾

(یوسف : ۱۰۸)

"تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے' میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں' علیٰ وجہ البصیرۃ میں اور میری پیروی کرنے والے"۔

گویا نہ میں خود ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں اور نہ فلسفیوں کی طرح ظن و تخمین کے تیر چلا رہا ہوں اور نہ ہی میرا ساتھ دینے والے اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں بلکہ ہم سب ایک واضح اور روشن راستے پر چل رہے ہیں اور ہم سب کا دل و دماغ پوری طرح مطمئن اور یکسو ہے۔

## غیر شعوری ایمان :

غیر شعوری ایمان سے مراد یہ ہے کہ حقائق پر یقین تو ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی intellectual element نہیں۔ یا تو انسان کا مزاج ہی intellectual نہیں ہے' اس کی استعداد ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس نے معاملے کو علیحدہ علیحدہ رکھا ہوا ہے۔ مثلاً اگر دل مطمئن ہے تو اس پر دماغ ساتھ نہیں دے پا رہا یا دماغ بات کو پا رہا ہے تو اس پر دل نہیں ٹھک رہا۔

دل و دماغ کی علیحدہ کیفیت کو ایک مثال سے سمجھ لیں۔ میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر کمال الدین عثمانی صاحب (ایم ایس سی باٹنی) سے دریافت کیا کہ ڈارون کے نظریئے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا کہ ڈارون کے فلسفے کے دلائل تو بڑے متاثر کرنے

والے(convincing) ہیں۔ دماغ اس پر convinced ہے لیکن دل کہتا ہے کہ کفر ہے۔ چنانچہ شعوری ایمان وہ ہے جس میں دل و دماغ دونوں متحد ہوں اور حقیقت میں یہی ایمان مطلوب ہے۔

## اہم حقائق

(۱) اصل چیز یقین ہے' چاہے وہ شعوری (دلائل و شواہد کی بنیاد پر) ہو یا غیر شعوری ہو۔ مثلاً ایک شخص کو شدید پیاس لگی ہے اور فرض کر لیجئے کہ اس نے کبھی پانی نہیں پیا اور نہ اسے پانی کا پتہ ہے۔ اب اس کی جان پر جو بیت رہی ہے اس کا تو اسے علم ہے۔ اس کیفیت میں کوئی اسے پانی کا گلاس دے دیتا ہے تو اس کو پی کر اسے یقین کامل ہو جاتا ہے کہ مجھے اسی چیز کی ضرورت تھی اور میرے اندر جو قیامت برپا تھی اس کا علاج یہی تھا' کیونکہ اس نے میری پیاس بجھادی ہے۔ اس کو یقین تو حاصل ہو گیا لیکن دلائل و شواہد کی بنیاد پر نہیں بلکہ تجربے کی بنیاد پر۔ البتہ اسے یہ معلوم نہیں کہ پانی کی کمی سے انسان کے جسم میں کیا فتور آتا ہے اور کس کس عضو پر کیا کیا قیامت بیت جاتی ہے۔

اس کے بالمقابل ایک ڈاکٹر کو معلوم ہے کہ پانی انسانی زندگی کے لئے کیوں ضروری ہے' اس کی کمی سے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں' کس کس عضو میں کیا خرابی پیدا ہو گی' کیونکہ ڈاکٹر intellectual element رکھتا ہے' اس کا علم علیٰ وجہ البصیرۃ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ عام آدمی کو تجربے سے یقین حاصل ہوا کہ پانی پیاس بجھاتا ہے اور ڈاکٹر کو علم حقائق کے ذریعہ معلوم ہوا کہ پانی پیاس بجھاتا ہے چنانچہ دونوں کا یقین ایک ہی ہے کہ "پانی پیاس بجھاتا ہے"۔

(۲) آخرت میں نجات کی اصل بنیاد قلبی یقین ہے اور یہی قلبی یقین انسانی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے' چاہے یہ قلبی یقین شعوری (intellectual) ہو یا غیر شعوری (non intellectual)۔ اس اعتبار سے یہ دونوں یقین بالکل برابر ہیں' چاہے آپ اس کے دلائل جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔ فلسفہ معلوم ہو یا نہیں' کوئی فرق نہیں پڑے گا' یقین ہونا چاہئے اور بس۔

غالباً امام رازی کا یہ قول ہے : اَمُوْتُ عَلٰی عَقِیْدَۃِ عَجَائِزِ نَیْشَابُوْر "میں نیشاپور کی بوڑھی عورتوں کے عقیدے پر جان دے رہا ہوں" ـــــ چنانچہ اصل مطلوب یقین

ہے چاہے وہ شعوری ہو یا غیر شعوری' اور یقین بہرحال انسانی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔

نوٹ : یہ صحیح ہے کہ شعوری اور غیر شعوری ایمان دنیا میں اصلاح کردار اور آخرت میں نجات کے لئے یکساں ہیں' لیکن ذہین لوگوں کی مجبوری ہے کہ ان کے سامنے علیٰ وجہ البصیرۃ والا ایمان پیش کیا جائے جو وہ قبول کر سکیں۔ یہ دورِ حاضر کی ناگزیر ضرورت ہے۔ کیونکہ ذہین لوگ اپنی ذہنی اور طبعی ساخت کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ پہلے کوئی بات ان کے ذہن و شعور کو اپیل کرے گی تو وہ دل تک جائے گی' تب وہ مانیں گے' ورنہ ان کے دلوں پر غلاف پڑے رہیں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام دور حاضر کی ضرورت کیوں ہے؟ اس کے دو اسباب ہیں:

پہلا سبب : دور حاضر میں سائنسی معلومات(Scientific Information) کا اتنا بڑا ظہور (explosion) ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ عوام بھی بند گلیوں میں تو نہیں رہتے' اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی معلومات میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔

دوسرا سبب : سمعی و بصری ذرائع ابلاغ نے جدید فلسفوں کو grass root level تک پہنچا دیا ہے۔ اب تو ایک ریڑھی بان یا ہل چلانے والا بھی استحصال جیسا ثقیل لفظ استعمال کرتا ہے۔ پہلے صرف الیکٹرک ریڈیو تھا' جہاں تک بجلی تھی وہیں تک کام کرتا تھا' ٹرانزسٹر آگیا' چنانچہ ایک کمہار بھی گدھے پر جا رہا ہے تو ٹرانزسٹر ساتھ بج رہا ہے' گاؤں میں ایک آدمی ہل چلا رہا ہے اور ٹرانزسٹر ساتھ لٹکا ہوا ہے۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن ہر گاؤں میں پہنچ چکا ہے۔ لوگ چاہے ڈرامے دیکھیں یا گانے سنیں فکر تو بہرحال منتقل ہو رہی ہے۔

ان دو اسباب کے بعد اب آپ صرف عوام الناس کو بھی اس وقت تک قائل نہیں کر سکیں گے جب تک ذہین طبقے (Intellectual) کی فکر پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔ چنانچہ آج کے دور میں اس کی اشد ضرورت ہے۔ علامہ اقبال کا شعر ہے ؎

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل!

واقعتاً آگ کی حدت کا صحیح ادراک اسے ہی ہو سکتا ہے جو آگ میں ڈالا جائے۔ جدید فلسفوں کا مطالعہ کرنے والوں کو ہی خبر ہے کہ برٹنڈ رسل اس دنیا میں کیا کچھ کر گیا ہے' کتنے کروڑ افراد اس کے فلسفۂ حیات سے متاثر ہوئے ہیں۔ ہمارے قدیم علماء کو کیا پتہ؟ انہوں نے تو فلسفہ پڑھا ہی نہیں۔ اگر پڑھتے بھی ہیں تو ارسطو کی منطق پڑھتے ہیں۔ حالانکہ جب تک اس دانش حاضر کا توڑ نہیں ہو گا ایمان کی کوئی تحریک عوامی سطح پر بھی بار آور نہیں ہو گی۔

## معرفتِ رب

ایمان مجمل : "اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَ صِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ" ایمان مجمل کی معراج ہے معرفتِ رب' اور بلاشبہ اس عالی مقام پر محمد رسول اللہ ﷺ فائز ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ تعلّی کی بجائے کسر نفسی سے کام لے کر کہیں ((مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ وَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ)) (۱۲) "اے اللہ ہم تجھے نہ پہچان پائے جیسا کہ تجھے پہچاننے کا حق تھا اور نہ تیری عبادت کر پائے جیسا کہ تیری عبادت ہونی چاہئے تھی" کسر نفسی کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک آدمی کوہ ہمالیہ پر بیٹھا ہے' ہمیں تو یہی نظر آ رہا ہے کہ اس سے اونچی بلندی کوئی نہیں' لیکن اسے معلوم کہ میرے اوپر اونچا آسمان بھی موجود ہے ؎

تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا
شاید وہ زمیں ہو کسی اور جہاں کی!

دوسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ نے یہ جملے جمع کے صیغے کے ساتھ اس لئے بیان کئے ہوں کہ امت کی طرف سے ترجمانی ہو جائے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ : (الانعام : ۹۱' الحج : ۷۴' الزمر : ۶۷)

"اور انہوں نے اللہ کے مقام کو نہیں پہچانا جس قدر اس کے مقام کو پہچاننے کا حق تھا۔"

دراصل روحِ انسانی میں معرفتِ رب بتمام و کمال موجود ہے اور یہی تصوف کا میدان ہے۔ اور اس روح کا تعلق باری تعالیٰ سے ہے۔ ؎

اتصالِ بے تکیُف بے قیاس

ہست رب الناس را با جانِ ناس

روحِ انسانی کا تعلق و اتصال ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے، لیکن ہم اس اتصال کو کسی شے پر قیاس نہیں کرسکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ـــــ لا مثل له ـــــ لا مثاله ـــــ لا مثیل له اور "لیس کمثله شیء" ہے۔

بے تکیف اور بے قیاس ہونے کے باوجود بہرحال اتصال موجود ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے) اپنے حواشی میں بہت پیارا شعر نقل کیا ہے ؂

جاں نہاں در جسم او ؛ در جاں نہاں

اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں!

ہماری جان کا تعلق روح سے ہے اور روح کا تعلق باری تعالیٰ سے ہے۔ جان انسان کے اندر ہے اور کسی نے نہیں دیکھی، بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہے، اس کا کیا رنگ ہے، اور اس کا کتنا وزن ہے؟ دو من کی لاش میں کتنے اونس جان کا وزن ہے؟ روسی سائنس دانوں نے بڑے حساس ترازو تیار کئے اور مرنے والے مریض کو اس کے اوپر رکھ دیا۔ جان نکلنے سے عین پہلے اور بعد کا وزن کرنے کے بعد انہوں نے دعویٰ کیا کہ جان کا وزن چند اونس ہوتا ہے۔ حالانکہ مرنے کے بعد جسم کے وزن میں کمی کی کئی دوسری وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔

بہرحال معرفتِ رب بلکہ محبت رب روحِ انسانی کے اندر ودیعت شدہ ہے۔ یہ بات ابتدا میں گزر چکی ہے کہ آخر انسان کیوں جوابدہ ہے؟ چاہے کوئی نبی آتا یا نہ آتا ـــــ اس لئے کہ انسان کو مندرجہ ذیل صلاحیتیں دی گئی ہیں۔

(۱) سمع و بصر (۲) فواد و عقل (۳) نیکی اور بدی کی فطری تمیز (۴) روح میں اللہ کی معرفت اور محبت ـــــ اور اسی کا نام نورِ فطرت ہے۔

## ایمان اور فطرتِ انسانی

ہم اپنی بول چال میں دو لفظ استعمال کرتے ہیں : (۱) جبلت وطبیعت (۲) فطرت جبلت و طبیعت کا تعلق حیوانی تقاضوں (animal Instincts) سے ہوتا ہے، جبکہ فطرت کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ﴾ (الروم : ۳۰)

"اللہ کی بنائی ہوئی وہ فطرت جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔"

چنانچہ نسل آدم کا ہر بچہ فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل میں معرفتِ رب موجود ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب وہ غیر اسلامی ماحول میں پرورش پاتا ہے تو اس کی یہ فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلاَّ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ ' فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ)) (۱۳)

"ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اسے یہودی بنادیتے ہیں یا نصرانی بنادیتے ہیں یا مجوسی بنادیتے ہیں۔"

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے : ((اَوْ یُشَرِّکَانِهٖ)) "یا اسے مشرک بنادیتے ہیں۔"

## حواشی

(۱) پوری حدیث اس طرح ہے :

((اِنَّ اللّٰهَ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ وَلْیُحِدَّ اَحَدُکُمْ شَفْرَتَهٗ فَلْیُرِحْ ذَبِیْحَتَهٗ فَتَلْتُمْ))

"اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں عمدگی اور خوبصورتی کو فرض کیا ہے۔ چنانچہ جب کسی کو قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور اپنی چھری کی دھار کو تیز کرلو تاکہ جانور کو آرام سے ذبح کیا جاسکے"۔ (صحیح مسلم کتاب الصید باب نمبر۱۱ و دیگر کتب حدیث)

(۲) جیسے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے "مبدا و معاد"۔ یعنی جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ ہماری زندگی کے سفر کا آغاز کیا ہے اور اس کی آخری منزل کونسی ہے؟

سنی حکایت ہستی تو درمیان سے سنی
نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

تو اس کا منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ :

نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم؟

اس کا نتیجہ Skepticism یا Agnosticism یعنی ارتیابیت لاادریت ہے۔

(۳) ڈاکٹر فضل الرحمٰن پاکستان میں بہت بدنام ہوئے۔ ان کے خلاف ۱۹۶۸ء میں ایجی ٹیشن بھی ہوا جو کہ ایوب کے زوال کا سبب بن گیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے وحی اور نبوت کا وہی تصور پیش کیا جو سابقہ فلاسفہ کا تصور تھا' بلکہ ان کی ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ بھی اسی موضوع Concept of Prophethood in Islam پر تھا۔ اہل سنت اور متکلمین اسلام کے نزدیک یہ کفر کا نیا ایڈیشن تھا' اس لئے ان کے خلاف بہت شدت سے تحریک چلی (ماخوذ)

(۴) صوفیاء سے مراد آج کے بھنگی' چرسی' قبروں کے مجاور یا بازاروں میں ننگ دھڑنگ پھرنے والے فاترالعقل لوگ قطعاً نہیں' بلکہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدمت اسلام کی خاطر ہر طرح کی مشقتیں برداشت کیں اور تمام ممکنہ وسائل کے ذریعے کلمۃ الاسلام لوگوں تک پہنچایا۔ (ابو عبدالرحمٰن)

(۵) صحیح البخاری کتاب الرقاق باب التواضع ح ۶۱۳۷

(۶) سنن الترمذی کتاب صفۃ القیامۃ باب ۵۹ ح ۲۵۱۶۔ امام ترمذی نے حدیث کو "حسن صحیح" قرار دیا ہے و مسند احمد ۱/ ۲۹۳ ح ۲۶۶۹ و ح ۲۷۶۳۔ (مسند عبداللہ بن عباس) استاذ احمد شاکر نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔

(۷) مسند عبد بن حمید ص ۲۱۴ ح ۶۳۶ اور یہ روایت المثنی بن الصباح راوی کی وجہ سے ضعیف ہے ملاحظہ ہو مختصر الکامل لابن عدی ص ۷۴۰۔ حالاتِ زندگی نمبر ۱۹۰۲۔

(۸) صحیح مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ و ترک العجز ح ۲۶۶۴

(۹) قرآن حکیم میں یہ حقیقت ۳۹ مرتبہ بیان ہوئی ہے۔

(۱۰) صحیح البخاری کتاب المظالم باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه ح ۲۴۱۰' و صحیح مسلم کتاب البر والصله باب تحریم الظلم حدیث ۲۵۸۰' وسنن الترمذی کتاب الحدود باب ماجاء فی الستر علی المسلم حدیث ۱۴۲۶' وسنن ابی دائود کتاب الادب باب المواخاة حدیث ۴۸۹۳۔

(۱۱) مسند احمد ۱/ ۳۹۱ ح ۳۷۱۲ و ۱/ ۴۵۲ ح ۴۳۱۸ و الاحسان ترتیب صحیح ابن حبان ۳/ ۲۵۳ ح ۹۷۲ و مسند ابی یعلی الموصلی ۹/ ۱۹۸ ح ۵۲۹۷ و المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰/ ۱۶۹ ح ۱۰۳۵۲ و کشف الاستار عن زوائد البزار ۴/ ۳۱ ح ۳۱۲۲ و المستدرک للحاکم ۱/ ۵۰۹ علامہ الالبانی' استاذ احمد شاکر' استاذ الارناووط اور استاذ حسین سلیم اسد سب نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور معترضین کا مسکت جواب دیا ہے۔

(۱۲) تلاش بسیار کے باوجود صرف اتنا جملہ ملا ہے : "مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ" ملاحظہ ہو المعجم الاوسط للطبرانی ۳۴۵/۴ ح ۳۵۹۲ تحقیق الدکتور محمود الطحان۔

(۱۳) صحیح البخاری کتاب الجنائز باب اذا اسلم الصبی فمات ح ۱۲۹۲ و ۱۲۹۳ و صحیح مسلم کتاب القدر باب کل مولود یولد علی الفطرۃ ح ۲۶۵۸ و دیگر کتب حدیث۔

نبی اکرمؐ کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ:—
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اِس اہم موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے